درس ۱۵

تواصی بالحق کا ذروۂ سنام
جہاد و قتال فی سبیل اللہ

سورۃ التوبہ اور سورۃ الحجرات کی روشنی میں

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ۔ اَمَّا بَعۡدُ:

اَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ثُمَّ لَمۡ یَرۡتَابُوۡا وَجٰہَدُوۡا بِاَمۡوَالِہِمۡ وَاَنۡفُسِہِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الصّٰدِقُوۡنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحُجُرٰت)

﴿قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ وَاِخۡوَانُکُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ وَعَشِیۡرَتُکُمۡ وَاَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَتِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَجِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾ (التوبة)

الحمدللہ کہ ہم اِس وقت مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے حصّہ چہارم کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ حصّہ ''سورۃ العصر'' میں وارد شدہ لوازمِ فوز و فلاح یا آسان الفاظ میں شرائط نجات میں سے تیسری شرط یعنی تواصی بالحق کی مزید تشریح اور تفصیل پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں ہمارے اس منتخب نصاب میں مختلف مواقع پر جو مباحث آ چکے ہیں' آگے بڑھنے سے قبل ان پر ذرا ایک نگاہِ بازگشت ڈال لینا مفید ہو گا۔ سب سے پہلے تو ''تَوَاصِیۡ بِالۡحَقِّ'' کی اصطلاح ہی پر دوبارہ غور کر لیجیے۔ لفظ ''تواصی'' وصیت سے بنا ہے اور وصیت میں تاکید کا مفہوم بھی شامل ہے۔ کوئی بات ناصحانہ انداز میں' خیر خواہی کے جذبے کے تحت' انتہائی شد و مد کے ساتھ کہی جائے تو عربی زبان میں اسے وصیت سے تعبیر کیا جائے گا۔ پھر جب یہ لفظ بابِ تفاعل سے آیا' یعنی ''تواصی'' تو اس میں مبالغے کا مفہوم بھی پیدا ہو گیا۔ یعنی یہ عمل بڑے اہتمام اور پوری شدت و تاکید کے ساتھ مطلوب ہے۔ دوسری طرف مزید توجہ دلا دی گئی کہ کسی بھی صحت مند اجتماعیت کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کے شرکاء ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہیں اور ایک دوسرے کو خیر و بھلائی کی بات کہتے رہیں۔ اسی طرح لفظ ''حق'' بھی بہت جامع ہے۔

جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' کہ ہر وہ چیز جو عقلاً مسلّم ہو' اخلاقاً واجب ہو' بامقصد اور نتیجہ خیز ہو' جو صرف وہمی و خیالی نہ ہو بلکہ واقعی ہو ''حق'' ہے۔ اس اعتبار سے ''تواصی بالحق'' کا مفہوم انتہائی وسعت اختیار کر جاتا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حقیقتوں اور چھوٹے سے چھوٹے حقوق سے لے کر اس سلسلۂ کون و مکان کی عظیم ترین حقیقت یعنی ''لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' اور ''اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ'' ان سب کی تبلیغ' نشر و اشاعت اور اعلان و اعتراف تواصی بالحق کے مفہوم میں شامل ہے۔

اس کے بعد ہمارے اس منتخب نصاب کے حصّہ اوّل میں دوسرا جامع سبق آیۂ بر پر مشتمل تھا۔ اس کے آخر میں واضح کر دیا گیا کہ یہ تواصی بالحق اس شان کے ساتھ مطلوب ہے کہ خواہ اس کے ضمن میں انسان کو فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑے' خواہ جسمانی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں' خواہ اس کا تقاضا ہو کہ انسان نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے اور اپنی جان کا ہدیہ اس راہِ حق میں پیش کر دے' اس کے پائے ثبات میں لغزش نہ آنے پائے۔ یہ انسان کے فی الواقع متقی' نیک اور صالح ہونے کے لیے ناگزیر ہے۔

تیسرے سبق میں تواصی بالحق کے ضمن میں ایک نئی اصطلاح ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' سامنے آئی تھی۔ وہاں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ معروف اور منکر کے الفاظ میں جس قدر وسعت اور ہمہ گیریت پائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے گویا مفہوم یہ ہو گا کہ ہر خیر' ہر نیکی' ہر بھلائی' ہر حقیقت اور ہر صداقت کی تبلیغ و تلقین' دعوت و نصیحت' تشہیر و اشاعت اور اعلان و اعتراف حتیٰ کہ ترویج و تنفیذ ہو اور اس راہ کی ہر تکلیف کو صبر و

استقامت کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ اس لیے کہ وہاں فرما دیا گیا تھا:

﴿یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۷﴾﴾ (لقمٰن)

اسی طرح ہر بدی اور برائی کی ردّ وقدح‘ تنقید واحتساب‘ انکار وملامت‘ حتیٰ کہ انسداد و استیصال کی ہر ممکن سعی وکوشش لازم اور ضروری ہے۔

پھر چوتھے سبق میں ’’دعوت الی اللہ‘‘ کی اصطلاح وارد ہوئی اور اس طرح تواصی بالحق کی بلند ترین منزل کی نشاندہی کر دی گئی۔ اس لیے کہ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ﴾ مجسم اور کامل حق صرف ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ ہے اور ؎

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق

کے مصداق اسی کی اطاعت وعبادت کا التزام‘ اسی کی شہادت علیٰ رؤس الاشہاد اور اسی کی اساس پر انفرادی واجتماعی زندگی کو استوار کرنے کی سعی وجہد تواصی بالحق کا ذروۂ سنام (climax) یا نقطۂ عروج ہے۔

اور آخر میں سورۃ الحجرات زیر درس آئی‘ جس میں حددرجہ جامع آیت حقیقی ایمان کی تعریف کے ضمن میں وارد ہوئی:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

’’یقیناً مؤمن تو وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر پھر وہ شک میں نہیں پڑے اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ‘ یہی لوگ درحقیقت سچے ہیں۔‘‘

گویا ایمان حقیقی کے دو ارکان کا بیان اس آیت مبارکہ میں ہو گیا——اوّلاً وہ ایمان جو ایک یقین کی صورت اختیار کر کے قلب میں جاگزیں ہو جائے اور ثانیاً اس کا وہ مظہر جو انسان کے عمل میں‘ اس کی عملی روش میں‘ اُس کے رویے میں نظر آنا چاہیے۔ اسے تعبیر کیا گیا ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ کے عنوان سے!

یہ ’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ ہمارے منتخب نصاب کے چوتھے حصے کے لیے اب ایک عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس اصطلاح نے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر دونوں کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ میں ہر مؤمن کے لیے ایک ترازو فراہم کر دی گئی ہے کہ وہ اسے اپنے باطن میں نصب کر کے اپنے آپ کو تولے‘ اپنے آپ کو جانچے اور پرکھے کہ وہ ایمان کے اعتبار سے حقیقتاً کس مقام پر کھڑا ہے۔ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا ......﴾ (التوبۃ: ۲۴)

’’(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں تمہارے باپ‘ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی‘ اور تمہاری بیویاں‘ اور تمہارے کنبے اور وہ مال جو تم نے جمع کیے ہیں اور وہ کاروبار (جو تم نے بڑی محنت سے جمائے ہیں اور) جن کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ رہتا ہے‘ اور وہ مکان (اور جائیدادیں جو بڑے اہتمام سے بنائی گئی ہیں اور جن کی تزئین و آرائش پر بہت کچھ صرف کیا گیا ہے) جنہیں تم بہت پسند کرتے ہو (اگر یہ سب چیزیں) تمہیں محبوب تر ہیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور اس کی راہ میں جہاد سے تو جاؤ انتظار کرو......‘‘

یعنی پانچ علائق دُنیوی اور تین مال واسبابِ دُنیوی کی صورتیں اس ترازو کے ایک پلڑے میں ڈال دو اور دوسرے پلڑے میں ڈالو اللہ کی محبت‘ اس کے رسولؐ کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت‘ اور پھر دیکھو کہ کہیں علائق دُنیوی اور مال واسبابِ دُنیوی والا پلڑا جھک تو نہیں رہا۔ اگر ایسا ہے تو جاؤ انتظار کرو...... بلکہ بامحاورہ ترجمے میں اس کا صحیح مفہوم اس طرح ادا ہو گا کہ ’’جاؤ دفع ہو جاؤ‘‘ ﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ﴾ ’’یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ سنا دے‘‘۔ ﴿وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ’’اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا‘‘۔

’’جہاد فی سبیل اللہ‘‘ کی اصل حقیقت

قرآنی آیات کے حوالے سے آج ہم اس بات پر غور کریں گے کہ جہاد فی سبیل اللہ

ہے کیا' اس لفظ کے لغوی معنی کیا ہیں' اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے' ہمارے دین میں اس کا مقام ومرتبہ کیا ہے' اس جہاد کی کیا کیا شکلیں ہیں' اس کے مقاصد کیا ہیں' اس کا نقطۂ آغاز کیا ہے' اس کی پہلی منزل کیا ہے اور اس کی آخری منزلِ مقصود کون سی ہے!! یہ بنیادی باتیں حقیقتِ جہاد کے بارے میں آج کی گفتگو کا موضوع ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات عرض کر دینا شاید نامناسب نہ ہو کہ جس طرح ہمارے تمام دینی تصورات ایک طویل انحطاط کی بدولت نہ صرف یہ کہ محدود (limited) بلکہ مسخ (perverted) ہو چکے ہیں' اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ جہاد کا لفظ بھی ہمارے ہاں بہت ہی محدود معنی میں استعمال ہو رہا ہے' بلکہ اکثر و بیشتر بہت غلط معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں ایک مغالطہ تو یہ ہوا کہ جہاد کو جنگ کے ہم معنی بنا دیا گیا' حالانکہ جہاد کے معنی ہرگز جنگ کے نہیں ہیں۔ جنگ کے لیے قرآن مجید کی اپنی اصطلاح ''قتال'' ہے جو قرآن میں بکثرت استعمال ہوئی ہے۔ یہ اصل میں جہاد کی ایک آخری صورت اور آخری منزل ہے' لیکن جہاد اور قتال کو بالکل مترادف بنا دینے کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اب جہاد کی وسعت اور ہمہ گیری پیش نظر نہیں رہی۔ اس ایک مغالطے کے بعد ستم بالائے ستم اور ظلم بالائے ظلم یہ ہوا کہ مسلمان کی ہر جنگ کو جہاد قرار دے دیا گیا' خواہ وہ خیر کے لیے ہو یا شر کے لیے۔ کوئی ظالم و جابر مسلم حکمران اپنی نفسانیت کے لیے' اپنی ہوسِ ملک گیری کے لیے کہیں خون ریزی کر رہا ہو تو اس کا یہ عمل بھی جہاد قرار پایا اور اس طرح اس مقدس اصطلاح کی حرمت کو بٹہ لگایا گیا ہے۔ ذرا تفصیل کے ساتھ اور بنظرِ غائر یہ جائزہ لینا ہوگا کہ قرآن مجید کے نزدیک جہاد کی اصل حقیقت کیا ہے!!

اس منتخب نصاب کے دروس کے دوران اس سے پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ عربی زبان بڑی سائنٹیفک زبان ہے۔ اس کے ننانوے فیصد سے زیادہ الفاظ وہ ہیں جن کا ایک سہ حرفی مادہ (root) ہوتا ہے اور اس کے تمام مشتقات کا دار و مدار اسی مادے یا ''جڑ'' پر ہوتا ہے اور اس کا مفہوم اس سے نکلنے والے تمام الفاظ میں موجود رہتا ہے۔ گویا یہ ''جڑ'' تو ﴿اَصۡلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرۡعُهَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾﴾ (ابرٰھیم) کے انداز میں اپنی جگہ مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے' لیکن مختلف سانچوں میں ڈھل کر وہ مادہ کچھ اضافی مفہوم اپنے اندر جمع کرتا چلا جاتا ہے۔

لفظ جہاد کا سہ حرفی مادہ ''ج۔ ھ۔ د'' ہے اور یہ لفظ اردو بولنے اور اردو لکھنے والوں کے لیے کسی درجہ میں بھی نامانوس نہیں ہے۔ جہد مسلسل' جدوجہد' یہ الفاظ اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ جہد کے معنی ہیں کوشش کرنا —— انگریزی میں اس کا مفہوم ان الفاظ میں ادا ہوگا: ''to exert ones utmost'' یعنی کسی بھی مقصد کے لیے' کسی بھی معین ہدف کے لیے محنت کرنا' کوشش کرنا' مشقت کرنا' جدوجہد کرنا اصلاً ''جہد'' ہے۔ لیکن عربی زبان میں یہی مادہ جب مختلف سانچوں میں ڈھلے گا' مختلف ابواب سے اس کے مصادر بنیں گے تو ان میں اضافی مفہوم شامل ہو جائے گا۔ ''مفاعلۃ'' ثلاثی مزید فیہ کا ایک باب ہے۔ اس باب میں جو الفاظ آتے ہیں اور جو مصادر اس وزن پر ڈھلتے ہیں۔ ان میں دو مفہوم اضافی طور پر شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس باب میں دو فریقوں یا ایک سے زائد فریقوں کی شرکت و مشارکت کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ (اب یہ ''مشارکت'' خود بھی ''مفاعلۃ'' کے وزن پر ہے) اور دوسرے یہ کہ ہر ایک فریق کا دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش اور بازی لے جانے کی سعی کا مفہوم بھی اس میں خود شامل ہو جائے گا۔ جیسے ''مباحثہ'' دو افراد یا دو فریقوں یا دو گروہوں کے مابین بحث کا نام ہے' جن میں سے ہر فریق کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے نقطۂ نظر کی حقانیت کو دلائل دے کر ثابت کرے اور فریقِ مخالف کے نقطۂ نظر کا ابطال کرے اور اس کی غلطی کو ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ ''مناظرہ'' اسی سے بنا ہے۔ اسی طرح دو فریق آمنے سامنے آئیں اور ان میں سے ہر فریق کی کوشش یہ ہو کہ وہ دوسرے کو زیر کرے اور خود بالادستی حاصل کرے تو یہ ''مقابلہ'' ہے۔ اسی طرح بے شمار الفاظ بنتے چلے جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ ''مشاعرہ'' میں بہت سے شعراء کسی ایک دیے ہوئے مصرعے پر طبع آزمائی کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مشاعرہ لوٹ لے جائے۔ تو اس وزن پر آنے والے ان تمام الفاظ میں یہ دو مفہوم لازماً پیدا ہو جائیں گے کہ کسی عمل میں

مشارکت اور اس مشارکت میں اس بات کی کوشش کہ ہر فریق دوسرے فریق کو زیر کرنے اور نیچا دکھانے کی کوشش کرے۔

اب اسی وزن پر لفظ ''مجاہدہ'' بنا ہے اور اسی طرح سے ''مقاتلہ'' بنا ہے۔ ''قتل'' اور ''مقاتلہ'' میں فرق یہ ہوگا کہ قتل ایک یک طرفہ فعل ہے۔ ایک شخص نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ جبکہ مقاتلہ یہ ہے کہ دو افراد ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لیے آمنے سامنے آ کھڑے ہوں' وہ اسے قتل کرنے کے در پے ہو اور یہ اُسے قتل کرنے کے در پے ہو۔ اسی طرح لفظ ''جہد'' میں یک طرفہ کوشش کا تصور سامنے آتا ہے' یعنی کسی ہدف اور مقصود کے لیے محنت کی جا رہی ہے' مشقت ہو رہی ہے' جبکہ مجاہدہ میں ایک اضافی تصور سامنے آئے گا کہ کوشش میں مختلف فریق شریک ہیں۔ ہر ایک کا اپنا کوئی مقصد اور اپنا کوئی نقطۂ نظر ہے اور ہر ایک اس کوشش میں ہے کہ اپنے مقصد کو حاصل کرے اور اپنے خیال یا اپنے نظریے کو دنیا میں سربلند کرنے کی کوشش کرے۔ ''جہاد فی سبیل اللہ'' درحقیقت قرآن مجید کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ جہاد اور مجاہدہ دونوں بابِ مفاعلہ سے مصدر ہیں۔ انگریزی میں اب اس کو یوں ادا کیا جائے گا: ''to struggle hard'' اس لیے کہ struggle میں کشمکش اور کشاکش کا مفہوم شامل ہے۔ جہد صرف کوشش ہے جبکہ جہاد یا مجاہدہ کشمکش اور کشاکش ہے اور انگریزی کے اس لفظ struggle میں بھی وہ تصور موجود ہے کہ مخالفتوں اور موانع کے علی الرغم اپنے مقصد معین کی طرف پیش قدمی کرتے چلے جانا۔

اب ظاہر بات ہے کہ مجاہدہ خواہ کسی مقصد کے لیے ہو اِس میں انسان کی صلاحیتیں' قوتیں اور توانائیاں بھی صرف ہوں گی اور مالی وسائل و ذرائع بھی صرف ہوں گے۔ ان دو کے بغیر دنیا میں کوئی کوشش ممکن نہیں ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ ابتدائی سطح پر کسی بھی مقصد کے لیے' کسی بھی نصب العین کے لیے' کسی بھی خیال کی ترویج و اشاعت کے لیے انسان کو کچھ مالی وسائل و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے' جن سے وہ اپنے نصب العین اور آئیڈیا کو project کر سکے' اس کی تشہیر و اشاعت ہو اور اسے وسیع حلقے میں پھیلایا جائے۔

لہٰذا قرآن مجید میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اس مجاہدے کے ساتھ دو الفاظ آپ کو ہر جگہ ملیں گے: ﴿بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ﴾ یعنی اس مجاہدے' اس جدوجہد اور اس کی کوشش میں اپنے مال بھی کھپاؤ اور اپنی جانیں بھی کھپاؤ' جیسے کہ سورۃ الحجرات کی آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ''۔

اس جہاد کے لیے ایک تیسری چیز جو ضروری ہے وہ کسی ہدف کا معین ہونا ہے۔ کوئی مقصودِ معین ہو' کوئی نصب العین ہو' کوئی آدرش ہو' جس کے لیے وہ محنت و مشقت کی جائے۔ اسی کی نظریاتی سطح پر نشر و اشاعت ہوگی' اسی کے لیے پھر محنتیں ہوں گی' اسی کی سربلندی کے لیے کوششیں ہوں گی۔ تو گویا کہ اس جہاد کے لیے اس ہدف کا تعین ضروری ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک شخص اپنی برتری کے لیے' اپنی بالادستی کے لیے' اپنے اقتدار کے لیے اور اپنے مفادات کے لیے محنتیں کر رہا ہے' اس کا یہ ہدف معین ہے' تو یہ بھی مجاہدہ ہے۔ اس لیے کہ ظاہر بات ہے کہ یہاں مختلف متقابل قوتیں موجود ہیں' ہر شے کے لیے مسابقت (competition) ہے' لہٰذا اس کے لیے اسے struggle کرنا ہوگی' محنت کرنا ہوگی' اسے دوسروں سے آگے بڑھنا ہوگا' اسے محنت و مشقت میں اپنے حریف یا مخالف سے بازی لے جانا ہوگی۔ اس کے بغیر اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے' اپنی ذاتی سربلندی کے لیے یا اپنی ذات کے لیے دُنیوی آسائشوں کو زیادہ سے زیادہ جمع کر لینے کے مقصد میں بھی کامیابی حاصل کر سکے۔ اس کو آپ یوں کہیں کہ یہ ''مجاہدہ فی سبیل النفس'' ہے۔ اپنی ذات کے لیے' اپنے نفس کے تقاضوں کے لیے مجاہدہ ہو رہا ہے۔ اور یہ بات کہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ یہ مجاہدہ ہر آن ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہ Struggle for existance ہے۔ ہر ایک بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کر رہا ہے اور اس کوشش میں ہے کہ وہ دوسرے سے آگے نکل جائے۔ جیسے کہا گیا: ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ (البقرۃ:۱۴۸) ''ہر ایک کے لیے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے''۔ ہر ایک نے اپنا ایک ہدف معین کیا ہوا ہے

اور ایک دوڑ لگی ہوئی ہے‘ ایک مسابقت جاری ہے۔

اسی طرح فرض کیجیے کہ کوئی شخص اپنا ہدف معین کرتا ہے اپنی قوم کی سر بلندی‘ اپنے وطن کی عزت‘ اس کے وقار اور دنیا میں کے نام کو نام روشن کرنے کے لیے۔ اس قوم پرستانہ اور وطن پرستانہ جدوجہد اور محنت وکوشش کا بھی قوموں اور ملکوں کے مابین مقابلہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو شخص بھی اپنی قوتوں‘ توانائیوں اور اپنی صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے وہ مجاہد ہے فی سبیل القوم‘ یا مجاہد ہے فی سبیل الوطن۔ اسی طرح کوئی شخص کسی نظریے (Ideology) کو اختیار کرتا ہے‘ وہ کسی نظریۂ حیات‘ کسی نظامِ زندگی کا قائل ہو گیا ہے اور سمجھتا ہے کہ انسان کے لیے وہ ایک بہتر طرزِ زندگی ہے‘ اس میں انسانی مسائل کا ایک بہتر‘ متوازن‘ زیادہ معتدل اور زیادہ منصفانہ حل ہے۔ اگر کسی طرح بھی اسے اس بات کا یقین حاصل ہو گیا ہے اور اب وہ اپنی قوتیں صرف کر رہا ہے‘ محنتیں کھپا رہا ہے‘ اوقات لگا رہا ہے‘ جسم وجان کی توانائیاں اس میں صرف کر رہا ہے کہ وہ نظریہ دنیا میں پھیلے‘ اس نظریے کو بالادستی حاصل ہو‘ اس کا نظام دنیا میں عملاً قائم ہو تو اس کے لیے جو محنت ہو رہی ہے یہ اس نظریے کے لیے جہاد اور مجاہدہ ہے۔ اس لیے کہ اس سطح پر بھی کوئی خلا موجود نہیں ہے۔ مختلف نظریات ہیں جو باہم متصادم ہیں۔ ہر ایک اپنی بالادستی اور supremacy کے لیے کوشاں ہے اور ان کے ماننے والے اس کے لیے تن من دھن لگا رہے ہیں۔ اب جو شخص کسی نظریے کو اختیار کر کے اس کے لیے محنت ومشقت کرتا ہے وہ اس نظریے کا مجاہد ہے۔ گویا اس اعتبار سے ہم اس جدوجہد کو مجاہدہ فی سبیل الاشتراکیۃ‘ مجاہدہ فی سبیل الوطن یا مجاہدہ فی سبیل الدیموکراتیہ کہہ سکتے ہیں۔ تو یہ ’’فی سبیل......‘‘ جو ہے جس کو انگریزی میں آپ ’’in the cause of‘‘ سے تعبیر کریں گے‘ اس کا تعین بھی اس مجاہدے کے لیے لازم ہے۔

اب آپ دیکھئے کہ متذکرہ بالا دونوں آیات میں ’’مجاہدہ فی سبیل اللہ‘‘ کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا: ﴿وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور انہوں نے جہاد کیا اللہ کی راہ میں اور کھپائی اس میں اپنی جان بھی اور اپنے اموال بھی‘‘۔ اسی طرح سورۃ البراءۃ (التوبۃ) میں فرمایا گیا: ﴿وَجِهَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِهٖ﴾ ’’اور اللہ کی راہ میں جہاد‘‘۔ اس سے پہلے بھی ہمارے اس منتخب نصاب میں یہی لفظ ’’جہاد‘‘ استعمال ہو چکا ہے۔ تیسرے سبق میں سورۂ لقمٰن کے دوسرے رکوع میں بیان ہوا کہ مشرک والدین اپنی اولاد کو اگر شرک پر مجبور کریں تو یہ ان کا مجاہدہ ہے۔ ایک مؤمن مجاہد فی سبیل التوحید ہے‘ مجاہد فی سبیل اللہ ہے اور اس کے مشرک والدین بھی مجاہدہ کر رہے ہیں‘ وہ بھی کوشش کر رہے ہیں‘ وہ اپنی اولاد پر دباؤ ڈال رہے ہیں بالفاظِ قرآنی: ﴿وَاِنۡ جَاهَدٰكَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِكَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَكَ بِهٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡهُمَا﴾ (آیت ۱۵) ’’اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ میرے ساتھ تو کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو اُن کی بات ہرگز نہ مان‘‘۔ یعنی اگر وہ دونوں تجھ سے جہاد کریں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی علمی دلیل نہیں‘ نہ عقل میں اس کے لیے کوئی بنیاد ہے‘ نہ انسان کی فطرت اس کی تائید کرتی ہے‘ نہ کوئی اور علمی استدلال اس کے حق میں موجود ہے‘ نہ خدا کی اتاری ہوئی کسی کتاب میں اس کے لیے کوئی سند پائی جاتی ہے‘ تو اگر وہ تم سے مجاہدہ کریں تو تم ان کا کہنا نہ مانو!

معلوم ہوا کہ یوں نہیں سمجھنا چاہیے کہ جہاد صرف ایک بندۂ مؤمن ہی کرتا ہے‘ بلکہ جہاد تو اس دنیا کا اصول ہے۔ یہ دنیا قائم ہی جہاد پر ہے۔ وہ لوگ جو مُردہ ہوں‘ جن میں سیرت وکردار نام کی کوئی شے موجود نہ ہو‘ جن میں درحقیقت کوئی خیال یا نظریے کی بلندی اور پختگی پیدا ہی نہ ہوئی ہو‘ جو حیوانی سطح پر صرف حیوانی جبلتوں کے تحت زندگی بسر کر رہے ہوں‘ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ زندگی بسر نہ کر رہے ہوں بلکہ زندگی انہیں بسر کر رہی ہو‘ اُن کا معاملہ مختلف ہے۔ لیکن اگر فی الواقع کسی شخص کا اپنا کوئی خیال اور نظریہ ہے‘ کسی بات کی حقانیت تک اسے رسائی حاصل ہوتی ہے‘ کسی چیز کی صحت پر اس کے دل نے (صحیح یا غلط) گواہی دی ہے‘ اس کی عقل نے اسے قبول کیا ہے‘ اس شخص میں اگر سیرت وکردار نام کی کوئی شے ہے‘ character کی کوئی قوت ہے‘ اگر وہ بامروّت انسان ہے تو اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اپنے اس نظریے اور خیال کے لیے‘ جس کی حقانیت پر اس

کے دل نے گواہی دی ہے اور جس کی صداقت کو اس کے ذہن اور دماغ نے قبول کیا ہے‘ اس میں مجاہدے کی کیفیت پیدا ہو‘ وہ اس کی نشر و اشاعت کے لیے اپنی امکانی سعی بروئے کار لائے‘ اس کے اعلان و اعتراف میں کسی بھی چیز سے خائف نہ ہو‘ یہاں تک کہ اگر جان دینے کا مرحلہ آئے تو اس کی خاطر جان قربان کر دے۔ یہ درحقیقت کسی بھی انسان کے صاحبِ کردار ہونے کے لیے شرطِ لازم ہے۔

اس سے پہلے یہ بات عرض کی گئی تھی کہ سورۃ العصر میں جو چار چیزیں بیان ہوئی ہیں وہ منطقی اعتبار سے انتہائی مربوط ہیں۔ عقل و منطق کے اعتبار سے ہر انسان کا طرزِ عمل کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی لازماً یہ ہونا چاہیے کہ پہلے وہ یہ دیکھے کہ حق کیا ہے‘ صحیح بات کیا ہے‘ انصاف کا نقطۂ نظر کون سا ہے! یہ تلاش اور تحقیق و تفتیش اس کے لیے لازم ہے۔ اور جب اسے حق و صداقت معلوم ہو جائے تو اب وہ اگر صاحبِ کردار انسان ہے تو اسے قبول کرنا اس کے لیے لازم ہے۔ پھر اس حق اور صداقت کی تعلیم و تبلیغ‘ اس کا اعلان اور اس کے لیے اگر کوئی تکلیف اور مصیبت آتی ہے تو اسے برداشت کرنا‘ لوگوں کی ناراضگی مول لینی پڑے تو اس کے لیے آمادہ رہنا‘ یہاں تک کہ اگر جان پر کھیل جانا پڑے تو اس سے گریز نہ کرنا اس کے صاحبِ کردار ہونے کا تقاضا ہے۔ آخر سقراط نے زہر کا پیالہ کیوں پی لیا تھا؟ اس لیے کہ اس پر کچھ حقیقتیں اور صداقتیں منکشف ہوئی تھیں — اور جب اس کے سامنے دو متبادل (alternatives) آئے کہ یا تو اِن صداقتوں سے اعلانِ براءت کر دو یا زہر کا پیالہ پی جاؤ تو اس نے زہر کا پیالہ پی جانے کو ترجیح دی اور حقائق سے مُنہ موڑ لینے کو گوارا نہ کیا۔ یہ بالکل دو اور دو چار کی طرح کی بات ہے کہ جس شے کی حقانیت پر انسان کے دل و دماغ نے گواہی دے دی اور جس صداقت پر اسے یقین ہو گیا‘ اب اس کی غیرت و حمیت اور شرافت کا تقاضا ہے کہ وہ اس کی نشر و اشاعت‘ اس کے اعلان و اعتراف اور اس کو دنیا میں غالب اور بالفعل رائج اور نافذ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دے اور اس کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو کر گزرے۔ اگر وہ یہ کرتا ہے تو وہ واقعتاً ایک صاحبِ کردار انسان ہے۔

دین کے اعتبار سے یہ تمام کیفیات جمع کر لی جائیں تو ان کے لیے جامع عنوان ہو گا ”جہاد فی سبیل اللہ“ یا ”مجاہدہ فی سبیل اللہ“۔ جس نے اس کائنات کی اصل حقیقت کو پہچان لیا‘ اللہ کو جان لیا‘ اس کو مان لیا‘ اب اللہ کے لیے اپنی جان اور مال کا کھپانا اس پر لازم ہے۔ ایک انسان اگر کسی چھوٹی سی حقیقت کا سراغ لگانے کے بعد اس حقیقت کے بیان میں اور اس کے اعلان و اعتراف میں اپنی جان دینا گوارا کر سکتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ ایک بندۂ مؤمن اللہ کو ماننے کے بعد اپنے گھر میں پاؤں پھیلا کر سوتا رہے اور اسے اس بات کی فکر نہ ہو کہ اللہ کا دین غالب ہے یا مغلوب!

لفظ جہاد کے لغوی مفہوم کے معین ہو جانے اور اس بات کو اصولی طور پر سمجھ لینے کے بعد کہ کسی بھی صاحبِ کردار اور صاحب سیرت انسان کے لیے کسی نظریے کو قبول کرنے کے بعد اس نظریے کے لیے اپنی جان و مال کا کھپانا ناگزیر ہو جاتا ہے‘ اب آئیے ہم یہ دیکھیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز کیا ہے‘ اس کی اوّلین منزل کیا ہے اور اس کی آخری منزلِ مقصود کون سی ہے۔ یہ تین باتیں جہاد فی سبیل اللہ کے ضمن میں بہت اہم ہیں۔

جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز: مجاہدہ مع النفس

ایک بندۂ مؤمن کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز خود اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا حاصل تو یہی ہے کہ انسان نے اللہ کو مانا‘ اللہ کے رسول کو مانا‘ اللہ کی کتاب کو مانا‘ آخرت کو مانا‘ بعث بعد الموت‘ حساب کتاب اور جزاء و سزا کو مانا۔ اگر یہ ماننا صرف اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ کے درجے میں نہیں ہے‘ محض ایک Dogma یا ایک متوارث عقیدہ (Recial Creed) نہیں ہے‘ بلکہ فی الواقع ان حقائق پر انسان کا ذہن مطمئن ہو چکا ہے‘ دل میں یقین جاگزیں ہو گیا ہے اور اس سے اس کا باطن منور ہو گیا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کے اپنے اندر ایک کشاکش پیدا ہو گی‘ ایک تصادم اس کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں برپا ہو جائے گا۔ ایک طرف نفس کے تقاضے اور انسان کا وہ نفس امّارہ (Baser Self) ہے جسے قرآن کہتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ”یقیناً نفس تو برائی پر اکساتا ہی ہے“۔ یا جسے

جدید محققین مثلاً فرائڈ نے ''ID'' یا ''LIBIDO'' سے تعبیر کیا ہے۔

انسان کے یہ حیوانی داعیات اور جبلی تقاضے (animal instincts) بڑے مُنہ زور ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ فرائڈ کا مشاہدہ اگر اسے اس طرف لے گیا کہ جنس کا جذبہ انسان میں ایک بڑا قوی محرک ہے تو یہ بات کلیتاً غلط نہیں ہے۔ فی الواقع یہ سارا تمدن کا ہنگامہ اور یہاں کی چہل پہل اسی کی بنیاد پر قائم ہے۔ اسی طرح اگر کسی اور مفکر نے اس حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا کہ پیٹ انسان کے اندر ایک بہت بڑا عامل اور محرک ہے اور انسان کی معاشی ضروریات اس کے لیے بہت بڑے محرک کی حیثیت رکھتی ہیں، تو واقعتاً اس میں ہرگز کوئی شک نہیں، یہ بڑے مُنہ زور داعیات ہیں۔ انسان کے اندر سے ابھرنے والے یہ داعیات اپنے طور پر کسی صحیح اور غلط، حلال اور حرام یا جائز و ناجائز کی تمیز کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ جذبات اندھے اور بہرے ہیں۔ انہیں صرف اپنے تقاضے کی تسکین سے غرض ہے۔ اگر بھوک لگی ہے تو پیٹ صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کے جہنم کو بھر دیا جائے۔ اگر شہوت کا جذبہ اُبھرا ہے تو اسے صرف اپنی تسکین سے غرض ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ حلال کیا ہے اور حرام کیا ہے، جائز کیا ہے اور ناجائز کیا ہے۔ لیکن اگر اللہ کو مانا ہے، اللہ کے رسول ﷺ کو مانا ہے تو ان کی طرف سے عائد کردہ حلال اور حرام کی قیود کی پابندی کرنی ہوگی۔ جیسے سورۃ التغابن میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ ایمان کا لازمی نتیجہ اطاعت ہے: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (آیت ۱۲) ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی''۔ یعنی اب تمہارے وجود اور تمہارے اعضاء و جوارح سے ایسی کوئی حرکت صادر نہیں ہونی چاہیے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کو توڑنے والی ہو۔ تمہارے تمام اعضاء و جوارح سے جو اعمال صادر ہوں وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یا جیسے کہ سورۃ الحجرات میں وارد ہے: ﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۱) ''اللہ اور اس کے رسولؐ سے آگے مت بڑھو''۔ مؤمن کی آزادی کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے تشبیہاً بیان فرمایا کہ مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ جس قدر رسّی دراز ہے اسی قدر وہ کھونٹے کے گرد گھوم پھر سکتا ہے، اس سے زائد نہیں۔ یہ حدودُ اللہ ہیں۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ (البقرۃ: ۱۸۷) ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کے قریب مت جاؤ''۔ اور کہیں فرمایا گیا: ﴿وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۲۹﴾ (البقرۃ) ''اور جو کوئی اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا تو وہی ظالم ہے''۔

تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کشمکش اور کشاکش ہے جو ایمان کے نتیجے میں انسان کی شخصیت کے داخلی میدانِ کارزار میں شروع ہو جاتی ہے۔ اس کشاکش کا آغاز اُسی لمحے ہو جاتا ہے جیسے ہی ایمان دل میں داخل ہوتا ہے۔ البتہ جب تک یہ ایمان نوکِ زبان پر رہتا ہے کوئی کشاکش نہیں ہوتی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ صرف قول ہی تو ہے، کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ، جیسے کہ آئندہ سورۃ الصّف کے درس میں یہ مضمون آنے والا ہے: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۲﴾ ''کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟'' قول اور فعل کا تضاد تو دنیا کی ایک عام مشاہدے کی چیز ہے کہ زبانی اقرار کسی اور بات کا ہے اور عمل کسی اور چیز پر ہو رہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی خیال یا کوئی نظریہ انسان کے باطن میں اتنا گہرا اتر جائے کہ وہ یقین بن کر دل میں بیٹھ جائے تو اب اس کا نتیجہ تصادم اور کشاکش کی صورت میں برآمد ہو کر رہے گا۔ اب ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ تمہاری بھوک ہو یا شہوت ہو، یا کوئی اور فطری جذبہ اور تقاضا تمہارے باطن میں سے ابھر رہا ہو، اس کی تسکین اب حلال اور حرام کی قیود اور حدود کے اندر اندر کرنی ہوگی، مادر پدر آزاد ہو کر اب کوئی کام نہیں ہوگا۔ یہیں سے اس کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ''اے اللہ کے رسولؐ! سب سے اعلیٰ اور افضل جہاد کون سا ہے؟'' جواباً آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ فِیْ طَاعَةِ اللّٰهِ)) ''کہ تو اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کرے اور اسے اللہ کی اطاعت کا عادی اور خوگر بنائے''۔ یہ نقطۂ آغاز ہے جہاد کا۔ جیسے کہ ایک اور مقام پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ)) (۱)

’’تم میں سے کوئی شخص حقیقی معنی میں مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی ہوائے نفس (اس کی خواہش نفس) تابع نہ ہو جائے اس کے جو میں لے کر آیا ہوں‘‘۔

یہ بات حقیقتِ شرک کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے کہ شرک کی ایک ابتدائی اور بڑی بنیادی کیفیت یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو اپنا معبود بنا لے۔ سورۃ الفرقان کی آیت ۴۳ میں فرمایا گیا: ﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـھَہٗ ھَوٰىہُ ط﴾ ’’کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟‘‘۔ مولانا رومؒ نے بھی فرمایا تھا: ؎

نفس ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیک او را عون ایں را عون نیست

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے، یہ خدا کے حکم سے سرتابی کرتا ہے، اس کے حکم کے مقابلے میں اپنی چاہت اور اپنی پسند کا تقاضا کرتا ہے کہ اُسے مقدم رکھا جائے، اسے بالاتری اور بالادستی حاصل ہونی چاہیے۔ یہ کشاکش درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا نقطۂ آغاز ہے۔

اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ جو لوگ مجاہدہ فی سبیل اللہ کے اس باطنی میدانِ کارزار میں کوئی فتح اور بالادستی حاصل کیے بغیر باہر کے دشمنوں سے لڑائی لڑنا شروع کر دیتے ہیں وہ دراصل خود فریبی کا شکار ہیں —— باہر کے دشمنوں سے نبرد آزمائی اور مجاہدہ و مقاتلہ سے پہلے اپنے نفس سے کشاکش اور اسے احکامِ الٰہی کا پابند بنانے کی جدوجہد لازم اور ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ جہاد و مجاہدہ کا صحیح اور فطری طریقہ یہی ہے کہ مجاہدے کا آغاز خود اپنی ذات سے ہو۔ جس طرح ایک پودا زمین میں سے نکلے، پھوٹے اور پھر پروان چڑھے تو وہ ایک مضبوط و تناور درخت بن سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿......اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾﴾ (ابراھیم) ’’اس (شجر طیبہ) کی جڑ

(۱) رواہ فی ”شرح السنۃ“۔ وقال النووی فی ”الاربعین“ ھذا حدیث صحیح، رویناہ فی ”کتاب الحجۃ“ باسناد صحیح۔

زمین میں گہری جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں‘‘۔ اسی طرح مجاہدہ مع النفس وہ جڑ ہے جو انسانی شخصیت کے باطن میں اگر گہری نہ اتر گئی ہو اور صرف اوپر ہی اوپر زمین میں اٹکی ہوئی ہو تو پھر یہ کسی بھی سیلاب اور کسی بھی نوع کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مرحلہ

یہ مجاہدہ مع النفس جب انسان کے باطن سے پھوٹتا ہے تو یہ اللہ کے دشمنوں سے اور اللہ کے دین کے دشمنوں سے مجاہدہ، کشاکش اور جدوجہد کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس کی اوّلین منزل دعوت اور تبلیغ و تلقین ہے۔ یہ درحقیقت اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا خارج میں پہلا ہدف ہے کہ جو بات آپ نے حق مانی ہے اس کی حقانیت کا اعلان کیجیے، اس کی حقانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیجیے۔ یہ آپ کی شرافتِ نفس کا تقاضا بھی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے کہ:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (۱)

’’تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے‘‘۔

اگر آپ نے ایک حق کو حق جان کر اور اسے اپنے لیے ایک دولت اور نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کیا ہے، تو اب آپ کی شرافت و مروّت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے بھائیوں تک بھی اس دولت کو پہنچائیے۔ اگر فی الواقع آپ ان کے خیر خواہ ہیں تو ان کو اس دولت سے محروم دیکھنے پر آپ کا دل کڑھنا چاہیے۔ اسی طرح غیرت وحمیت کا تقاضا بھی ہے کہ اس حق کو دنیا میں پھیلایا جائے اور عام کیا جائے۔

پہلا ہدف: دعوت و تبلیغ

دعوت و تبلیغ کو آپ یوں کہہ لیجیے کہ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کا ابتدائی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ۔

مرحلہ ہے۔اس میں تلقین اور نصیحت بھی شامل ہے اور حق کی نشر و اشاعت اور اس کا ابلاغ بھی۔اس ابلاغ کے لیے ظاہر بات ہے کہ ہر دَور میں جو بھی ذرائع میسر ہوں گے وہ بھرپور طریقے پر استعمال کیے جائیں گے۔ نبی اکرمﷺ نے اپنے زمانے میں جو ذرائع بھی ممکن تھے' ان سب کو استعمال کیا ہے۔ آپؐ کوہِ صفا پر کھڑے ہوتے ہیں اور نعرہ لگاتے ہیں: ''وَاصَبَاحَا!'' ''ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے!'' یہ اُس زمانے کا رواج تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ کوئی دشمن حملہ کرنے والا ہے تو وہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے اپنے کپڑے اتار کر اور بالکل عریاں ہو کر کسی بلند مقام پر کھڑا ہو جاتا تھا تاکہ سب لوگ اسے دیکھ سکیں' اور پھر نعرہ لگاتا تھا: وَاصَبَاحَا! یعنی ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے۔لوگ سمجھ جاتے تھے کہ کوئی بڑی اہم بات ہے۔ چنانچہ سب اس کی طرف لپکتے تھے۔اور پھر وہ اپنی خبر یا اطلاع لوگوں تک پہنچاتا تھا۔رسول اللہﷺ کے بارے میں اس کا ہرگز کوئی سوال یا امکان نہیں تھا کہ آپﷺ عریاں ہو جاتے' لیکن باقی آپؐ نے وہ پورا طرزِ عمل اختیار کیا۔کوہِ صفا پر بلند مقام پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا' لوگ جمع ہوئے' آپﷺ نے دعوت پیش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورے مجمع میں سے کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور آپﷺ کے سب سے قریبی رشتہ دار ابولہب نے یہ زہر آلود الفاظ کہے: ''تَبًّا لَكَ' اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا؟'' (آپ کے ہاتھ ٹوٹ جائیں' کیا آپؐ نے اس کام کے لیے ہمیں جمع کیا تھا؟) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ!۔ بہرحال اس وقت یہ بتانا مقصود تھا کہ اس ابلاغ' تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے جو بھی وسائل ممکن ہوں اختیار کیے جانے چاہئیں۔سیرت میں ہمیں نظر آتا ہے کہ انفرادی ملاقاتیں بھی تھیں' آپؐ گلیوں میں بھی تبلیغ فرماتے تھے' جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ ٹھہرا ہوا ہے وہاں پہنچ کر اپنی دعوت پیش فرماتے تھے۔ حج کے ایام میں آپؐ کی یہ دعوتی سرگرمی پورے عروج کو پہنچ جاتی تھی۔ ملک کے کونے کونے سے لوگ آئے ہوتے تھے' آپؐ مختلف وادیوں میں گھومتے اور جہاں کہیں کسی قبیلے کا پڑاؤ دیکھتے وہاں جا کر اپنی دعوت پیش کرتے۔ گویا وہ نقشہ ہوتا جو حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعا میں نظر آتا ہے:

﴿قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹﴾ (نوح)

''کہا اے میرے پروردگار! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز پکارا' مگر میری پکار نے ان کے فرار میں ہی اضافہ کیا۔اور جب بھی میں نے ان کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے ان کو ہانکے پکارے دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا''۔

یعنی اے میرے ربّ! اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اس قوم کو فرداً فرداً بھی پکارا' عام مجمعوں میں بھی انہیں دعوت دی' میں تنہائی میں بھی ان سے ملا' میں نے علی الاعلان بھی یہ بات کہی ہے' میں نے رات کی تاریکیوں میں بھی پیغام پہنچایا ہے اور دن کی روشنی میں بھی اس پیغام کی نشر و اشاعت کی ہے۔

یہ ہے درحقیقت جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین مرحلہ۔ اسے تبلیغ کہیے' دعوت کہیے یا نشر و اشاعت کہیے۔اس میں محنت و مشقت ہوگی' اوقات صرف ہوں گے' صلاحیتیں کھپیں گی۔ضرورت اس بات کی ہوگی کہ باصلاحیت لوگ آئیں اور اپنی صلاحیتوں کو اس راہ میں صرف کریں' ذہین اور فطین نوجوان آئیں اور وہ اس کام میں اپنے آپ کو جھونک دیں۔ نبی اکرمﷺ پر ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پھر اپنے کاروبار میں منہمک نہیں ہوئے' بلکہ آپؓ اسی کشاکش' اسی کوشش اور اسی جدوجہد میں ہمہ تن مصروف ہو گئے' اور چند سال کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عشرہ مبشرہ (رضی اللہ عنہم) میں سے چھ اصحاب کو لا کر انہوں نے محمدؐ رسول اللہﷺ کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ ہے اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کی پہلی منزل!

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ جنگ اور قتال کا مرحلہ تو نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ

میں کہیں پندرہ برس کے بعد آیا۔ مکہ مکرمہ کے تیرہ برسوں میں اور پھر قیامِ مدینہ کے ابتدائی دو برسوں میں مجاہدہ جاری رہا۔ یہ جدوجہد اور کشاکش نظریاتی سطح پر تھی۔ یہ عقائد کا تصادم تھا جو جاری تھا اور اس میں لوگ تکالیف اور مصیبتیں بھی جھیل رہے تھے۔ جن لوگوں نے نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا اور نیا عقیدہ اختیار کیا ان کی اپنے گھروں اور اپنی برادریوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اپنے ماحول کے ساتھ ان کا تصادم پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا۔ وہ ستائے گئے' ان کو ایذائیں دی گئیں' جس کا نقشہ ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت میں دیکھ چکے ہیں کہ: ﴿فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا......﴾ (آیت:۱۹۵) ''پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میرے راستے میں ستائے گئے اور انہوں نے قتال کیا اور مارے گئے......'' یہ قتال کا مرحلہ یعنی غزوۂ بدر کا واقعہ تو کہیں ۲ھ کا ہے' لیکن پہلے پندرہ برس یہ کشاکش اور تصادم جاری تھا۔ پھر جن لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا ان کی تربیت کرنا اور ان کو ایک منظّم جماعت کی شکل دینا بھی تو مجاہدے ہی کی ایک شکل تھی۔

دعوت و تبلیغ کی غرض و غایت: اتمامِ حجت

مجاہدہ فی سبیل اللہ کا اوّلین ہدف یہ ہے کہ خلقِ خدا پر خدا کی طرف سے دعوت و تبلیغ کے ذریعے حجت قائم کر دی جائے' تاکہ روزِ قیامت انسان یہ عذر نہ پیش کر سکے کہ اے ربّ! ہمیں معلوم نہ تھا کہ تیرا دین کیا ہے۔ یہ بات ہمارے آئندہ درس (سورۃ الحج کی آخری آیات) میں وضاحت کے ساتھ آئے گی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کی ایک بہت بڑی غرض ''شہادت علی الناس'' قرار دی گئی ہے۔ یہ گواہی اور شہادت قولاً بھی دی جاتی ہے اور عملاً بھی' تاکہ خلقِ خدا پر حجت قائم ہو جائے اور اس کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام میں محنتیں بھی لگیں گی اور صلاحیتوں کا صرف بھی ہو گا' تب ہی تو کوئی داعئ حق خلقِ خدا پر حجت قائم کر سکے گا کہ جو حق میرے پاس تھا میں نے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے' تم یہ نہ کہہ سکو گے کہ میں نے اس کے بیان میں کتمان سے یا اخفا سے کام لیا ہے۔ اب آپ اسے قطع عذر کہہ لیں یا اتمامِ حجت' بہرکیف یہ جان لیجیے کہ مجاہدہ فی سبیل اللہ کی اوّلین منزل یہی ہے۔

مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف

اس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف اور اس کی غایت قصویٰ کیا ہے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس کائنات کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اُسی کا حکم نافذ ہونا چاہیے۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ وَالْحُكْمُ لِلّٰهِ۔ زمین بھی اللہ کی ہے اور حکم بھی اللہ کا ہے۔ بالفاظ قرآنی: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ﴾ (یوسف:۶۷) حکم (اور فیصلے) کا اختیار سوائے اللہ کے کسی کو حاصل نہیں''۔ گویا تمام حقائق میں سب سے فائق حق یہی ہے کہ اللہ کی زمین پر اُسی کے اختیار کو عملاً نافذ و غالب ہونا چاہیے' جبکہ بالفعل معاملہ اس کے برعکس ہے۔ چنانچہ اس حق کو بالفعل دنیا میں نافذ کرنے کے لیے اب ایک مزید محنت درکار ہو گی' مزید جدوجہد کی ضرورت ہو گی۔ دعوت و تبلیغ کے لیے محنتیں اور کوششیں اپنی جگہ اہم ہیں' لیکن یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اگر کسی بے ضرر قسم کی بات کی تبلیغ کی جا رہی ہو' جس میں کسی پر کوئی تنقید نہ ہو اور جس میں کسی کے مفادات پر کوئی آنچ نہ آتی ہو تو کوئی تصادم نہیں ہو گا' کوئی ٹکراؤ نہیں ہو گا' بلکہ بالعموم ایسے واعظین کو ہار پہنائے جاتے ہیں اور ان کی خدمت کی جاتی ہے۔ لیکن اگر تبلیغ ہو صحیح معنی میں کہ جس میں حقیقت ہی کو سامنے لایا جائے اور حق بات کے کہنے سے دریغ نہ کیا جائے' خواہ اس سے لوگوں کے مفادات پر آنچ آ رہی ہو' یا ان کے غلط نظریات اس سے مجروح ہو رہے ہوں' تو ظاہر بات ہے کہ تصادم اور کشمکش کا مرحلہ آ کر رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصادم اور کشمکش مکی دَور میں بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے آگے مرحلہ آتا ہے جب داعئ حق یہ کہتا ہے کہ ہم صرف مبلغ نہیں ہیں' ہم صرف داعی نہیں ہیں' بلکہ ہم تو حق کو قائم اور غالب کرنے کے لیے اٹھے ہیں' ہم عدل و انصاف کا صرف وعظ کہنے کے لیے نہیں آئے' بلکہ ہم عدل و انصاف کو بالفعل نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہے جو سورۃ الشوریٰ میں نبی کریم ﷺ سے کہلوائی گئی کہ اے نبی! ان سے کہہ دیجیے: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ (آیت:۱۵)

”اور کہ مجھے تو یہ حکم ہوا ہے کہ میں تمہارے مابین عدل کروں“۔ ظاہر بات ہے کہ جب دعوت یہ ہو گی کہ اللہ کا عطا کردہ نظامِ عدل قائم کیا جائے‘ اسے نافذ اور رائج کیا جائے تو یہ صرف تبلیغ و تلقین اور وعظ و نصیحت کا مرحلہ نہیں ہے‘ بلکہ اقامت دین کا مرحلہ ہے۔ یہ صرف کسی نظام کی برکات کو علمی سطح پر پیش کر دینے کا مرحلہ نہیں بلکہ اس نظام کو فی الواقع قائم اور نافذ کر دینے کا مرحلہ ہے۔ تو سیدھی سی بات ہے کہ یہاں تصادم اب مزید شدت اختیار کرے گا۔ جن کے مفادات پر آنچ آئے گی وہ اسے کبھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کریں گے۔ وہ اپنی پوری قوتوں کو اور اپنے تمام وسائل و ذرائع کو مجتمع کر کے مزاحمت کریں گے اور اس دعوت کی راہ روکنے اور اسے کچلنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے۔ اس مرحلے پر یہ کشاکش اور تصادم انتہائی شدید اور ہولناک صورت اختیار کرے گا۔

جہاد فی سبیل اللہ کی آخری منزل: قتال فی سبیل اللہ

تو اقامت دین اور غلبۂ دینِ حق کی اس جدوجہد میں‘ جس کے لیے قرآن مجید کی ایک اصطلاح ”اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ“ کی بھی ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ کوئی خواہ کتنا ہی ناپسند کرے تصادم کی یہ آخری منزل آ کر رہے گی‘ آگ اور خون کی ندیوں کو بہرحال عبور کرنا ہو گا‘ اپنے خون کا نذرانہ بہرکیف پیش کرنا ہو گا۔ اس لیے کہ یہ نظام کو بدلنے کا معاملہ ہے‘ وعظ اور نصیحت سے آگے بڑھ کر عدل اور انصاف کو بالفعل رائج کرنے کا معاملہ ہے۔ یہاں وہ تصادم انتہائی شدت پکڑ لیتا ہے‘ اور جہاد بالفعل ”قتال“ کی شکل اختیار کرتا ہے۔

یہ ہے گویا اُس مجاہدہ فی سبیل اللہ کا نقطۂ عروج‘ جس کا نقطۂ آغاز ہے ”مجاہدہ مع النفس“۔ نفسِ انسانی سے یہ مجاہدہ جب خارج کی طرف آتا ہے تو یہ تبلیغ دین‘ دعوتِ دین‘ احقاقِ حق‘ ابطالِ باطل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی صورتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دنیا میں حق کی نشر و اشاعت اور بدی کے سدّباب کے لیے وعظ و نصیحت‘ تلقین و تبلیغ اور افہام و تفہیم کی تمام قوتوں کو بروئے کار لانا اور ابلاغ کے ممکنہ ذرائع کو استعمال کرنا اس جدوجہد کا اوّلین مرحلہ ہے اور اس سے اصل مقصود یہ ہے کہ خلقِ خدا پر خدا کی جانب سے حجت قائم کر دی جائے ——— اور اس کی بلند ترین منزل ہے ”اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ“ کہ پورے کے پورے دین اور پورے نظامِ زندگی پر اللہ کے دین کو غالب کر دیا جائے۔

قرآن مجید اس حقیقت کو کہیں یوں بیان کرتا ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال: ۳۹) ”اور (اے مسلمانو!) ان کے ساتھ جنگ کرو (اور تمہاری یہ جنگ جاری رہنی چاہیے) یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے“۔ اس زمین پر اللہ کا حق ہے کہ اسی کی حکومت قائم ہو۔ لیکن اگر یہاں کسی اور نے اپنی حکمرانی کا تخت بچھایا ہوا ہے اور کسی فرعون یا نمرود کی مرضی یہاں رائج ہے تو یہی درحقیقت قرآن حکیم کی اصطلاح میں فتنہ ہے۔ یہ فساد فی الارض کی بدترین شکل ہے۔ اس فتنے کو ختم کرنا اور اس بغاوت کو فرو کرنا ایک بندۂ مؤمن کا مقصدِ حیات بن جانا چاہیے۔ اگر وہ واقعتاً اللہ کو ماننے والا ہے اور اگر اس نے واقعتاً دین کو قلب اور ذہن کی متفقہ شہادت کے ساتھ قبول کیا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ پھر وہ ایسے ہر نظام کو جس میں خدا کی مرضی اور خدا کے حکم کو فائنل اتھارٹی کی حیثیت سے قبول نہ کیا جائے‘ فتنہ اور بغاوت سمجھے گا‘ چاہے وہاں بظاہر بڑا امن وامان ہو اور وہاں ہر طرح سے زندگی کا کاروبار سکون سے جاری ہو۔ قرآن کی رو سے غیر اللہ کی حکومت اور غیر اللہ کا نظام مجسم فتنہ‘ مجسم فساد اور مجسم بغاوت ہے‘ لہٰذا اس کے خلاف سینہ سپر ہو جانا اور اپنے جان و مال کو دین کی حمایت میں کھپا دینا ایمان کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ ایمانِ حقیقی کا رکن لازم ہے۔

ہمارے اس دورِ انحطاط میں‘ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا گیا‘ جہاد فی سبیل اللہ پر دو ظلم روا رکھے گئے۔ ایک یہ کہ اس کو جنگ کے مترادف قرار دے دیا گیا۔ چنانچہ اس کی وسعت‘ اس کی ہمہ گیری‘ اس کا نقطۂ آغاز‘ اس کے وہ سارے مراحل جن میں دعوت و تبلیغ بھی ہے‘ نشر و اشاعت بھی ہے‘ پھر جو لوگ اس حق کو قبول کر لیں ان کو ایک نظم میں پرو کر

ایک منظّم قوت کی شکل دینا اور انہیں آئندہ کے مراحل کے لیے مناسب تربیت دینا بھی شامل ہے' یہ سب ذہن سے بالکل خارج ہو گئے۔ دوسرا ظلم یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہر جنگ کو بہر حال اور بہر نوع جہاد قرار دے دیا گیا۔ اس طرح ''جہاد'' کے لفظ کو ہم نے انتہائی بدنام کر دیا اور اس کے مقدس تصور کو بہت بری طرح مجروح کیا گیا۔ اور تیسرا ظلم اس پر یہ ڈھایا گیا کہ جہاد کو فرائض دینی کی فہرست سے خارج کر دیا گیا کہ یہ فرضِ عین نہیں ہے' بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ یہ درحقیقت مسلمانوں کے اندر سے جذبۂ جہاد کو ختم کرنے کی سازش کا حصہ ہے۔ کہیں یہ سازش بڑے ہی گھناؤنے انداز میں ہوئی' جیسے کہ غلام احمد قادیانی (علیہ ما علیہ) نے جہاد اور قتال کو اس دور میں بالکل منسوخ قرار دے دیا کہ ع ''دیں کے لیے حرام ہے اب دوستو قتال!'' یہ تو خیر انتہائی گمراہی کا معاملہ تھا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود ہمارے تصوراتِ دینی میں اب یہ جہاد فی سبیل اللہ کسی فرض کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ نماز فرض ہے' ہمیں یہ معلوم ہے کہ روزہ فرض ہے' ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ زکوٰۃ ہر صاحبِ نصاب پر فرض ہے اور ہمیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ حج ہر صاحبِ استطاعت پر فرض ہے' لیکن یہ بات بالکل ذہن سے نکل چکی ہے کہ جہاد بھی فرضِ عین ہے' یہ بھی دین کی طرف سے عائد شدہ کوئی ضروری فریضہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اس تصور کو عام کیا جائے۔

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ جہاد کا شمار ''ارکانِ اسلام'' میں نہیں ہوتا۔ اسلامی ریاست کے شہری ہونے کے لیے اور ایک مسلمان معاشرے میں ایک فرد کی حیثیت سے کسی کے قبول کیے جانے کے لیے جو کم سے کم لوازم ہیں' ان میں واقعتاً جہاد کا نام نہیں ہے۔ بخاری و مسلم سے مروی حدیث نبویؐ کے الفاظ واضح ہیں:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ: شَهَادَةِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ' وَاِقَامِ الصَّلَاةِ وَاِیْتَاءِ الزَّکَاةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ))[۱]

''اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: اس بات کی گواہی کہ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں' اور نماز قائم کرنا' اور زکوٰۃ دینا اور (بیت اللہ کا) حج کرنا اور رمضان المبارک کے روزے رکھنا۔''

ارکانِ اسلام میں یہی پانچ چیزیں ہیں' لیکن وہ ایمانِ حقیقی' جس کی بنیاد پر آخرت میں معاملات طے ہوں گے' جس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کسی کو آخرت میں مؤمن قرار دے گا' اس ایمانِ حقیقی کے ارکان دو ہیں: ایک یقین' جو قلب میں جاگزیں ہو گیا ہو اور دوسرا جہاد' جو انسان کے عمل میں یقینِ قلبی کا اوّلین اور نمایاں ترین مظہر ہے۔ اور یہ وہ کشاکش اور تصادم ہے' اس راہ میں جان اور مال کا کھپانا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز ہے خود اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند بنانے کے لیے اس کے ساتھ مجاہدہ۔ اور اس کے لیے پھر ابتدائی مرحلہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ' نشر و اشاعت اور تمام ممکنہ ذرائع ابلاغ کو کام میں لا کر حق کی دعوت کو پھیلایا جائے۔ اور اس کی آخری منزل یہ ہے کہ جس طریق سے اس شخص نے اپنے وجود پر اللہ کے دین کو قائم اور اللہ کی مرضی کو نافذ کیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کو اس پر بالفعل قائم کر دیا ہے' اسی طرح پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کو عملاً نافذ اور غالب کرنے کے لیے جان اور مال لگائے۔ اس کے لیے تن من دھن سے کوشش کرے اور اگر ضرورت داعی ہو تو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں حاضر ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ توفیق دے تو مرتبۂ شہادت حاصل کرے۔

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

یہ ہے اسلام میں جہاد کا وہ تصور جو اب ہمارے آئندہ دروس میں مزید وضاحت کے ساتھ سامنے آئے گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ oo

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب بنی الاسلام علیٰ خمس۔